تذکرہ آب بقا کا تنقیدی و تقابلی جائزہ

Critical and Comparative Review of *Tazkirah Abe Baqa*

زبیر صدیقی*

Abstract

Hazrat Khawaja Muhammad Abdur Rauf Ishrat (late) (1868-1940), the pupil of Sheikh Muhammad Jan Shaad Peromeer, his devotion for knowledge and his love for literature is eminent. Wihin and outside Hindustan where people speak Urdu, the glow of scholarship is felt and seen. Any newspaper, magazine and pamphlet that were published from any nook or corner of the country never dared any publication benefitted from Khawaja's works. The first edition of Tazkira Abe Baqa was published at Munshi Nol Kashor Press, Hazrat Ganj Lucknow in February 1918. Its second edition was published by Nizami Press Lucknow after 1918. The year of publication is not mentioned, but it can be considered the second edition according to its content. Mirza Jafar Ali Nishtar provided further information by doing in-depth research and gleaned chunks of poetry keeping in view their poetic aspect.

تلخیص

حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔ بڑی طویل عرق ریزی کے بعد 'تذکرہ آبِ بقا' کے دو مرتب نسخے دریافت ہوئے۔ 'تذکرہ آبِ بقا' سب سے پہلے منشی نول کشور پریس لکھنؤ حضرت گنج میں فروری ۱۹۱۸ء میں چھپا۔ اس نسخے میں ایک فہرست مضامین دی گئی ہے، جس کا آغاز شاہ اختر (واجد علی شاہ) اور اس کا اختتام

* ریسرچ اسکالر: شعبہ اردو، جامعہ کراچی، متعین لیکچرار، ایف جی لیاقت علی ڈگری کالج، راولپنڈی

شعرا کے مزار کے موضوع پر ہوتا ہے۔ اس تذکرے کے کل صفحات کی تعداد ۲۱۶ ہے۔ کتاب کے اختتام پر ضمیمے کے طور پر عشرتؔ لکھنوی صاحب کی شاعری بعنوان ''خمخانۂ عشرتؔ'' کے نام سے مرتب ہے۔ یہ تذکرہ شاگردِ عشرتؔ مرزا جعفر علی نشترؔ صاحب نے مرتب کیا تھا۔

نسخۂ دوم 'آبِ بقا' کے نام سے نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کے سرورق پر اس کی اشاعت کا کوئی احوال نظر نہیں آتا۔ اس میں مضامین کی فہرست موجود نہیں ہے۔ اس نسخے میں مختلف شاعروں کے احوال کے حوالے سے اضافہ اور ترمیم بھی کی گئی ہے، جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ تصنیف ۱۹۱۸ء کے بعد کی ہے۔ اس تذکرے کے کل صفحات کی تعداد ۲۴۰ ہے۔ ''خمخانۂ عشرت'' کو اس تذکرے کا ایک حصہ دکھایا گیا ہے۔ اس کے ماخذات کی بابت سے یہ مشہور ہے کہ اس تذکرے میں جو حالات اور واقعات بتائے گئے ہیں، وہ غیر معتبر اور بے سروپا روایتوں کا گنجینہ ہے۔ اس حوالے سے مرزا خنجرؔ لکھنوی اپنے مضمون ''خواجہ عشرتؔ مرحوم'' میں یہ تحریر کرتے ہیں:

> ''آج بھی لکھنؤ میں ایسے نہ جانے کتنے بدنصیب خاندان موجود ہیں جو زمانے کی سخت گیریوں سے مفلس اور نادار ہو چکے تھے۔ وہ لوگ جن کے آبا ءاجداد بڑے کروفرشان وسطوت سے حکومت کررہے تھے۔ خواجہ صاحب اس قسم کے لوگوں کو عزت واحترام سے پاس بٹھا کر گزشتہ حالات دریافت کرتے تھے۔ کچھ وہ باتیں جو سینہ بہ سینہ ودیعت ہوتی آئیں تھیں اور کچھ خاندانی شجرو شاہی فرمانوں اور عدالتی دستاویزات سے اخذ کرکے اپنے طریقے سے لکھ کر چھپوا دیتے تھے۔ ان میں اکثر چیزیں ایسی ہوتی تھیں جنھیں مؤرخین نے یا تو مصلحتاً نظر انداز کر دیا تھا یا ان تک تحقیق کی نگاہ کو رسائی نصیب نہیں ہوئی تھی۔'' (۱)

کسی بھی امر کی اصلی شکل کی دریافت اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ صحیح صورت حال معلوم ہو سکے۔ اس سلسلے میں جو شہادتیں مہیا کی جائیں اور جو معلومات حاصل کی جائے، وہ ایسی ہونا چاہیے کہ استدلال کے کام آ سکے، تاکہ واقعات کی ترتیب میں صحیح طور پر اس سے مدد ملے اور حدود تحقیق کے اندر نتائج نکالے جا سکیں۔ اس لیے یہ لازم ہوگا کہ جن امور پر استدلال کی بنیاد رکھی جائے، وہ اس وقت تک کی معلومات کے مطابق، بظاہر حالات شک سے بری ہوں اور جن مآخذ سے کام لیا جائے، وہ قابلِ اعتماد ہوں۔ غیر متعین، مشکوک اور قیاس پر مبنی حالات کا مصرف جو بھی ہو، ان کی بنیاد پر تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول نتائج نہیں نکالے جا سکتے۔ (۲)

حوالے کے تین درجے ہیں: مستند، غیر مستند، مشکوک۔ ''مستند'' کی جگہ ''معتبر'' کا لفظ بھی استعمال کیا

جا سکتا ہے۔ معتبر یا مستند سے مراد یہ ہے کہ وہ حوالہ اس وقت تک کی معلومات کے مطابق، اعتبار کے اس درجے میں ہو کہ اس سے استدلال کیا جا سکے اور اس کی بنیاد پر نکالے گئے نتائج کو قبول کیا جا سکے (بہ شرط یہ کہ اخذ شدہ نتائج میں غیر منطقی اندازِ نظر سے کام نہ لیا جائے) غیر مستند کو مستند کی ضد سمجھے۔ مشکوک اس حوالے کو کہیں گے جس کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہ کہی جا سکے۔

گویا وہ مزید تحقیق کا محتاج ہے اور اس بنا پر، موجودہ صورت میں، اس کو نہ قطعی طور پر رد کیا جا سکتا ہے نہ قبول کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ اس اختلاف تعریف کے باوجود، استدلال کی حد تک مشکوک اور غیر مستند کو ایک ہی درجے میں رکھا جائے گا۔ جس طرح غیر معتبر حوالے استدلال کے کام نہیں آ سکیں گے، اسی طرح مشکوک حوالوں کی بنیاد پر نکالے گئے نتائج بھی نہ قابل قبول رہیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ استدلال کی بنیاد مستند حوالوں پر رکھی جائے۔ اگر کوئی شخص غیر مستند یا مشکوک حوالوں کو بنائے استدلال بنائے گا تو اس استدلال کو نا قابلِ قبول قرار دیا جائے گا۔ (۳)

عشرتؔ لکھنوی کے حوالے سے چند تاریخ بین حضرات معترض تھے کہ یہ مضامین معتبر نہیں ہیں۔ نہ تاریخ کی کتابوں، نہ کسی اور ذرائع سے ان احوال کا سراغ ملتا ہے۔ اسی اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مرزا خنجرؔ لکھنوی لکھتے ہیں:

> ''جب یہ خیالات خواجہ صاحب کے کانوں تک پہنچائے گئے تو فرمایا: معترضین سے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ بجز اس کے کہ میں تاریخی واقعات تصنیف کرنے پر قادر ہوں۔ البتہ احباب کی تسلی کو کہوں گا کہ تاریخیں تین حالتوں سے خالی نہیں ہوا کرتیں۔ یا مؤرخین نے چشمِ دید حالات لکھے ہیں یا قدیم تاریخوں سے اقتباس کیا ہے یا پوچھ کے کھوج لگایا ہے۔ میرے مضامین کا بڑا حصہ آخر الذکر تعریف کے ماتحت ہے۔ یہ باقیات الصالحات جن کے سینے تاریخی واقعات کا گنجینہ ہیں، آنکھوں دیکھی یا اسلاف سے سنی سنائی باتیں بیان کرتے ہیں۔ ان میں تھوڑا بہت مبالغہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ترتیب کے وقت خارج کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح ہم اپنے عہد سے پہلے مؤرخین پر ایمان لے آئے ہیں۔ یوں ہی آنے والی نسلیں ان مضامین پر اعتقاد رکھیں گی۔'' (۴)

راوی کی حیثیت کیا ہے، یہ بہت اہم سوال ہے۔ کتابوں سے استفادہ کرتے اور حوالہ دیتے وقت اس کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے۔ جن لوگوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان کو افسانہ تراشی کا شوق تھا، یا یہ کہ وہ ہر طرح کے حوالوں سے بلا تکلف کام لیا کرتے تھے۔ تو ایسے راویوں کی روایتوں کو خاص طور پر جانچے پرکھے بغیر قبول نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً یہ بات معلوم ہے کہ محمد حسین آزادؔ کی کتاب 'آبِ حیات' میں صحیح و غلط ہر طرح کی روایتیں

محفوظ ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ہر جگہ محض اتفاق یا بشریت کو دخل نہیں۔ وہ مرحوم آرائشِ گفتار کی خاطر واقعہ تراشی کو بھی روا رکھتے تھے۔

یا مثلاً یہ معلوم ہو کہ صفیر بلگرامی، شمس اللہ قادری اور نصیر حسین خیاؔل معتبر و غیر معتبر ہر طرح کی روایتوں کو درج کتاب کرلیا کرتے تھے یا مثلاً یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ انتظام اللہ شہابی روایتیں گھڑنے اور عبارتیں وضع کرنے میں تکلف نہیں کیا کرتے تھے۔(۵)

ایسی روایتیں جن کے واحد راوی اس قبیل کے افراد ہوں، اس وقت تک مشکوک روایتوں کے زمرے میں شامل رہیں گی، جب تک کہ ان کی تصدیق کسی معتبر ذریعے سے نہ ہو جائے۔(۶)

تاریخ ادب کی کتابیں، لغات، انتخابات، نصابی کتابیں، ان کتابوں میں اور ان جیسی میں قدیم و جدید شاعروں کا کلام اور نثر کے اجزا محفوظ ہیں۔تفصیلات تو اور بھی ہو سکتی ہیں، مگر حاصل کلام یہی ہے کہ حوالہ اگر معتبر نہیں تو تحقیق کے نقطۂ نظر سے وہ قابلِ قبول ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اعتبار کے لئے اور امور کے علاوہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ وہ واقعہ بہ ظاہر حالات اس دنیا کے معمولات کے مطابق ہو۔اسی طرح محیر العقول حکایتیں بھی اس دائرے سے باہر کی چیز ہیں (بجائے خود ان کی جو بھی حیثیت ہو)۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ ایک برات دریا میں ڈوب گئی تھی اور تین دن کے بعد ایک صاحب کی دعا سے وہ صحیح سلامت باہر نکل آئی، تو خواہ وہ راوی اس کا مدعی ہو کہ یہ اس کا چشم دید واقعہ ہے، مگر ادبی تحقیق میں اس ''چشم دید گواہی'' کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ بظاہر حالات، اس دنیا کے معمولات کے مطابق، یہ واقعہ عقلاً قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتا۔(۷)

عشرؔت نے جو لکھا ہے، وہ محض گپ ہے۔ چوں کہ انہوں نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ مآخذ کا حوالہ نہ دیا جائے، اس لیے وہ اس قسم کی بے سر و پا باتیں نہایت آسانی سے لکھتے چلے گئے ہیں۔ میر تقی میرؔ کے حالات میں لکھا ہے:

> ''ان کے ایک فرزند تھے، سید حسن عسکری تخلص عرشؔ تھا۔ مرنے لگے تو اپنے بیٹے سے کہا کہ تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس دولت دنیا میں سے تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر ہمیں فخر و ناز ہو، ہاں کچھ زبان اردو سے متعلق علم سینہ ہے، جو ہمیں بہ مشورہ ماموں سراج الدین خاں آرزؔو کے خدا نے عطا کیا ہے اور اسی کے بھروسے پر ہم کو ہمیشہ ناز و استغنا رہا اور انہیں معلومات پر شاہی درباروں میں ہماری عزت و تکریم ہوئی۔ میں نے ان کو تمہارے واسطے ایک کتاب کی صورت میں لکھ لیا ہے، اس کتاب کا نام 'اصول اردو' ہے۔ یہ وصیت کرتا ہوں

کہ اس کتاب کو بہت حفاظت سے رکھنا، اور اگر کوئی اولاد نرینہ نہ ہو تو کسی اہل شاگرد کو یہ امانت تفویض کرنا۔''(۸)

یہ روایت محض داستان سرائی ہے۔ آخری جملہ اس لیے لکھا ہے کہ اس (فرضی) مجموعہ قواعد اردو کے حصول کا راستہ صاف ہو جائے۔ خواجہ عشرتؔ کے الفاظ میں ''عرشؔ نے وہ کتاب اپنے شاگرد ''شادؔ پیرو میرؔ کے سپرد کی''اور یہ وصیت کی کہ '' تم کو اختیار ہے کہ اپنے جس شاگرد کو قابل اور لائق دیکھنا، اسے دینا''۔ اس وصیت کے مطابق (جس کے واحد راوی خود عشرتؔ ہیں) شادؔ نے اسے اپنے لائق شاگرد عبدالرؤف عشرتؔ کے حوالے کر دیا اور اس لائق شاگرد نے اس سفینۂ راز یعنی'' قواعدِ میر'' کو افادۂ عام کی خاطر شائع کرایا۔ مرحوم اس رسالے کو بہت پسند فرماتے تھے۔ ان کی تالیفات میں سے سب سے اول اس رسالے کو مرزا جعفر اور میں نے طبع کرا دیا تھا کہ اس کی آمدنی سے دوسری تالیفات کی طباعت ہو سکے گی۔ مگر کلکتہ کی سکونت نے اس خیال کو عمل سے تبدیل نہ ہونے دیا۔(۹)

اس صدی کی پانچویں دہائی کے آخر میں جب سردارؔ جعفری نے میرؔ کا انتخاب مرتب کیا تو اس کے آغاز میں ''میرؔ کی وصیت'' کے عنوان سے اس جعلی رسالے کا ایک اقتباس بھی شامل کر لیا۔(۱۰)

سینہ بہ سینہ کی سند مضمون نگار کے لیے تو قابل قبول ہو سکتی ہے مگر دوسروں سے اس قدر خوش عقیدگی رکھنا اور اس کا مطالبہ کرنا سوائے وقت کے زیاں کے اور کچھ نہیں ہے۔ جب تک معتبر حوالہ نہ ملے اس وقت تک ان کا انتساب نا قابل قبول رہے گا۔

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا، کیونکہ ذرائع معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ حجابات بتدریج اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے کہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے نئی معلومات کے امکانات کی نفی نہیں ہو سکتی۔ تحقیق میں دعوے سند کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہوتے اور سند کے لیے ضروری ہے کہ وہ قابلِ اعتماد ہو۔ قابلِ اعتماد ہونا، مختلف حالات میں مختلف امور پر منحصر ہو سکتا ہے۔ اس کی قطعی حد بندی تو مشکل ہے، لیکن اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ بظاہر حالات حوالہ مشکوک نہ معلوم ہوتا ہو اور دلیل منطق کے خلاف نہ ہو۔ روایت کے سلسلے میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ راوی کون ہے۔ اس کے ساتھ اکثر صورتوں میں یہ معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے کہ کن حالات

میں روایت کی گئی تھی۔ خاص طور پر ان بیانات کے سلسلے میں جو کوئی شخص اپنے متعلق یا اپنے متعلقین واسلاف کے متعلق دیا کرتا ہے، کیونکہ ایسی صورتوں میں دانستہ یا نادانستہ غلط بیانی کا احتمال بہت کچھ رہا کرتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ اچھے خاصے محتاط کسی خاص موضوع سے ایسا جذباتی تعلق رکھتے ہوں وہ اس موضوع کی حد تک احتیاط کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھ سکیں۔ مثلاً، واجد علی شاہ کا ذکر آتے ہی وہ بہت جذباتی ہوجایا کرتے تھے۔ یہ قول بھی قابلِ توجہ ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدی فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چوں کہ لوگ مجھ کو بے استاد (غیر تربیت یافتہ) کہتے تھے۔ ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔(۱۱)

راوی کی شخصیت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جن لوگوں کے متعلق معلوم ہے کہ وہ واقعہ تراشی اور داستان سرائی سے بھی بلا تکلف کام لیا کرتے تھے۔ یا کوئی صاحب اس قدر خوش گمان اور زود یقین ہیں کہ تحقیق کی مشکل پسندی کے حریف نہیں ہو سکتے، تو ایسے مولفین اور راویوں کے فرمودات اور مختارات کو اس وقت تک بنائے استدلال نہیں بنایا جانا چاہئے، جب تک کہ کسی معتبر ذریعے سے تصدیق نہ ہوجائے۔ بالواسطہ روایت پر انحصار اگر ضروری ہوتو بہت احتیاط کے ساتھ استفادہ کرنا چاہئے۔ اگر آخذ قابلِ حصول ہوتو یہ راہ راست استفادہ کرنا چاہئے اور اس کو لازم سمجھنا چاہئے۔ بالواسطہ استفادے سے آدمی بعض اوقات بے طرح مبتلائے غلط فہمی ہوجایا کرتا ہے۔ حافظہ جس طرح مدد کیا کرتا ہے، اسی طرح دھوکا بھی دیا کرتا ہے۔ بارہا یہ ہوا ہے کہ یادداشت پر بھروسہ کیا گیا اور کتاب دیکھنے پر معلوم ہوا کہ صورت حال مختلف تھی۔ حافظے سے مدد لینا چاہئے، آنکھیں بند کرکے اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے اور کتاب دیکھے بغیر کسی بھی بات کو حوالۂ تحریر نہیں کرنا چاہئے۔(۱۲)

خواجہ صاحب نے 'تذکرہ آبِ بقا' میں کسی بھی قسم کا کوئی حوالہ تحریر نہیں کیا ہے سوائے چند حوالوں کے۔ وہ بھی جو صرف چند علاقوں اور جگہوں کے اور کوئی حوالہ نظر نہیں آتا ہے۔ 'تذکرہ آبِ بقا' کے مرتب نے واقعات اور سنین کے ذیل میں کہیں بھی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اسی طرح منتخب کلام کے متعلق بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ انہوں نے کن نسخوں سے استفادہ کیا ہے اور بہ لحاظ اعتبار و استناد ان نسخوں کی کیا حیثیت ہے۔ یہ اصول تحقیق کے خلاف ہے اور اس لیے اس کتاب کے مندرجات کو شک کی نظر سے دیکھا جائے گا اور تصدیق کے بغیر قابلِ قبول قرار نہیں دیا جائے گا۔ تذکرۂ معاصرین کے مرتب نے بھی تحقیق کے اس اصول کو نظر انداز کیا ہے۔(۱۳)

مؤلف تذکرہ نے بیشتر مقامات پر یہ نہیں بتایا کہ یہ معلومات انہیں حاصل کہاں سے ہوئیں۔اب اگر کوئی شخص مزید تحقیق یا تصدیق کی غرض سے یہ معلوم کرنا چاہے کہ جو بات لکھی گئی ہے، وہ کہاں سے ماخوذ ہے، تو اسے کچھ معلوم نہیں ہوسکتا۔آج شاید اس بات کو کچھ زیادہ محسوس نہ کیا جائے، مگر کل جب آج سے بہت سے راوی اور مصنف موجود نہیں ہوں گے۔اس وقت یہ سوال شدت کے ساتھ اٹھے گا کہ مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ کہاں سے ماخوذ ہے اور کس کی روایت پر مبنی ہے؟ اس علم کے بغیر روایت کی صحت وعدم صحت یا ترجیح کے متعلق فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔جن کتابوں سے معلومات حاصل کی گئی ہے، ان کا حوالہ دینا تو لازم تھا ہی، جن لوگوں سے مؤلف نے ذاتی طور پر معلومات حاصل کی ہے، اس معلومات کے ذیل میں ان کا حوالہ دینا بھی ضروری تھا، کیوں کہ راوی کے تعین کے بغیر، روایت کا مرتب بھی متعین نہیں کیا جاسکتا۔مؤلف نے وفات کے ساتھ ولادت اور بعض دوسرے واقعات کے سنین بھی درج کیے ہیں۔وفات کا سن تو یوں بغیر حوالہ درج کیا جاسکتا ہے کہ وہ مؤلف کے ذاتی علم کا نتیجہ ہے اور وہ مسلسل ایک سلسلہ خاص میں ان سنین کو زمانۂ وقوع کے قریب ترین وقفے میں جمع کرتے رہے ہیں لیکن باقی سنین تو بغیر کسی حوالے کے قبول نہیں کیے جاسکتے۔مثلاً آتش کی پیدائش اور اس کا مدفن یہ ایک اختلافی مسلہ ہے۔ناسخ کی پیدائش اور مدفن۔سودا کی تاریخ پیدائش اور تاریخ انتقال۔انشا کے دو مدفن بتائے گئے ہیں۔یہ ایک مختصر سا احوال ہے۔پورے تذکرے میں کہیں بھی کسی بھی شاعر یا نثر نگار کے احوال اور حالات میں کہیں بھی کوئی حوالہ یا ماخذ نہیں لکھا گیا۔ایسے میں اس تذکرے کی حیثیت مشکوک ہوجاتی ہے۔

خواجہ صاحب صفیر کے حالات میں لکھتے ہیں کہ غالب مرحوم سے صفیر نے بذریعہ خط کتابت شرف تلمذ حاصل کیا۔(۱۴)

واضح رہے کے صفیر اور غالب کے تعلقات کا آغاز ۱۲۸۰ھ سے ہوتا ہے جب صفیر نے غالب کی شاگردی کی درخواست کی تھی۔۱۲۸۱ھ تک صفیر اور غالب میں خط کتابت رہی ۱۲۸۳ھ کے شروع میں دہلی چلے گئے اور دو ڈھائی مہینے قیام کیا۔اس مدت میں انھیں غالب کو دیکھنے کا موقع ملا۔(۱۵)

مشکوک کا دائرہ بہت وسیع ہے۔کہیں انتساب کا مسئلہ ہے، کہیں الحاقی کلام کا مسئلہ ہے اور کہیں کچھ اور۔ایسے مجموعے حوالے کے طور پر قابلِ قبول ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔جب تک انتساب سے صحتِ متن اور الحاقی کلام تک ہر بات قابلِ قبول حد تک معلوم نہ ہوجائے، اس وقت تک ان کو ماخذ کا درجہ نہیں دیا جانا

چاہئے۔ یوں چھاپتے رہیے اور بیچتے رہیے اور مقالے لکھتے رہیے۔ بیٹھے سے بیگار بھلی۔ جیسے امیر خسروؔ سے منسوب ہندوی کلام، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب رسائل وغیرہ۔ عبدالباری آسیؔ مرحوم کے ''دریافت کیے ہوئے''، ''کلام غالبؔ'' کا حال اب سب کو معلوم ہو چکا ہے یا غالبؔ سے منسوب وہ غزل جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ غالبؔ نے کبھی بھوپال کا سفر بھی کیا تھا اور جس کے متعلق میں معلوم ہوا کہ وہ دراصل ''اپریل فول'' کا تحفہ تھی، جسے کو ہمارے بعض اہل قلم نے جوشِ عقیدت میں فوراً قبول کر لیا تھا۔ ایسے اور بہت سے کارنامے سامنے آ چکے ہیں۔ اس لیے مشکوک اجزا کو حوالے کے طور پر نہ استعمال کرنا چاہیے نہ قبول کرنا چاہئے۔(۱۶)

خواجہ صاحب نے اس تذکرے میں جو شاعروں کا انتخاب پیش کیا ہے، اس کا کہیں کوئی حوالہ یا ماخذ نظر نہیں آتا کہ انھوں نے اشعار کا جو یہ انتخاب پیش کیا ہے اس کی تاریخی یا زمانی حیثیت کیا ہے۔ یہ اشعار کس بیاض، دیوان، یا کس کلیات سے لیے گئے۔ اس سلسلہ میں پورا تذکرہ مع اپنے انتخاب کے خاموش ہے۔

ذوقِ افسانہ تراشی کی کارفرمائیاں کچھ کم نہیں اور جو لوگ ایسے راویوں کی روایتیں، تصدیق کے بغیر حوالے کے طور پر قبول کیا کرتے ہیں، وہ پہلے تو خود مبتلائے غلط فہمی ہوتے ہیں اور پھر دوسروں کو اس کی برکتوں میں شریک کرتے ہیں۔

یہ مُسلّمات میں سے ہے کہ مستند نسخے کو ماخذ بغیر کسی اقتباس کو اس اعتماد کے ساتھ نہیں پیش کیا جا سکتا کہ اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے، وہ درست ہے۔ اس احساس نے صحت متن کی اہمیت کو ذہن نشین کیا۔ اس زمانے کا یہ قابلِ ذکر رجحان ہے، جس نے تدوین کی مستقل اور منفرد حیثیت کو تسلیم کرایا۔ محض یادداشت یا سماعت پر بھروسہ کر کے اشعار پیش کر دینا یا کسی بھی سہل الحصول ثانوی ماخذ سے عبارتوں کو نقل کر دینا عام بات تھی (اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں)۔ تحقیق کے فروغ نے احتیاط کی عادت پیدا کی اور اعتراض کرنا سکھایا اور اس بات کو ضروری سمجھا جانے لگا کہ شعر ہو یا عبارت، اس کو معتبر ترین ماخذ سے منقول ہونا چاہیے۔ اس طرح ماخذ کی تحقیقی اہمیت نمایاں ہوئی۔ حوالہ اصل ماخذ سے منقول نہیں، تو پیش کرنے والا کتنا ہی معروف شخص ہو اور کتنا ہی پڑھا لکھا ہو، اسے قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ اس طرح اہم بات یہ ہوئی کہ ''شخص'' کے بجائے 'ماخذ' کو اہمیت حاصل ہوئی، ورنہ اب سے پہلے شخص کی اہمیت کا زیادہ عمل دخل رہتا تھا۔

یہ شاید سب سے زیادہ پریشان کن چیز رہی ہے تدوین و تحقیق کے سلسلے میں انسانی ذہن کچھ اس طرح ایمان لے آتا ہے اپنے ذوق اور اپنی یادداشت پر کہ چھان بین کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

'تذکرہ آب بقا' میں بہت سے اشعار حوالے کے بغیر لکھے گئے ہیں اور ہر جگہ یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مؤلف کے قول کو کس بنا پر قابل قبول سمجھا جائے۔ اسی سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مؤلف نے بالعموم سنین بغیر حوالہ درج کتاب کیے ہیں اور یہ قاعدے کے خلاف ہے۔ افراد اور واقعات کے سلسلے میں وہ سنہ لکھتے چلے گئے اور حوالے دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اصولاً ایسے مندرجات لازماً قابلِ قبول نہیں۔ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ واقعات اور سنین انہیں کہاں سے معلوم ہوئے؟ حوالہ نہ واقعات کا دیا ہے نہ متن کا۔ اس صورتحال میں ان واقعات اور سنین کو کس طرح معتبر مانا جاسکتا ہے؟ پورا تذکرہ ایسی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔

حوالہ دینے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا مجبور ہوتا ہے کہ معتبر ترین ماخذ سے کام لے اور اگر کسی سن میں کسی طرح کا اختلاف ہے، تو پہلے اس کی وضاحت کرے کہ اس نے اس سن کو کس بنا پر مرجح سمجھا ہے۔ مآخذ کا ذکر نہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ لکھنے والے کو آسانی بہت ہو جاتی ہے، مگر ایسے مقامات کی کم اعتباری سے بھی گراں بار ہو جاتے ہیں۔ ایسے سارے سنین و واقعات جو حوالے کے بغیر لکھے گئے ہیں، نا قابلِ قبول ہیں۔ اس خامی نے اس تذکرے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ چوں کہ مؤلف نے بہت سے مقامات پر غیر معتبر حوالوں اور روایتوں کو بھی بلا تکلف قبول کر لیا ہے، اس لیے حوالے کا مسئلہ خاص اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

اس طرح 'آب بقا' بے سرو پا روایتوں سے بھری پڑی ہے، جسے خواجہ عشرت نے محض داستان سرائی کے لئے زیب قرطاس کیا۔ شعرا کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر تنقیدی رائے بھی دی گئی ہے۔ یہ آراء زیادہ تر تعریفی کلمات پر مبنی ہے، جو مبالغہ کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔ درج ذیل سطور میں چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

> ظفر کے کلام پر اس اعتبار سے نظر کی جائے کہ اس میں محاورے کس طرح ادا کئے گئے اور روزمرہ کیا ہے۔ اثر کتنا ہے، زبان کس قدر مستند ہے تو ان کا مثل و نظیر آپ کو نہ ملے گا۔ اس لحاظ سے کہ زبان اور محاورات کے تو یہ بادشاہ تھے جو لفظ قلعہ معلیٰ سے نکلتا وہ شعراء کے لئے سند ہو جاتا۔ (۱۷)
>
> ریاض کے کلام میں شوخی کے علاوہ شوکت الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور عموماً کلام شاعری کے سقم سے بہت پاک ہے۔ زبان اور روزمرہ کے محاورے میں صاف صاف مطلب ادا کرنا جس سے سننے والے کے دل پر اثر ہو ریاض کا خاص حصہ ہے۔ (۱۸)
>
> آتش کے کلام میں تشبیہات کی لطافت، استعارات کی نزاکت، رنگ رنگ کے خیالات، تصوف کی جھلک با ہمت توکل استغنائے عمدہ مضامین فلسفہ معاشرت اور خانگی زندگی کی خصوصیات زمانہ کی رفتار، گفتار، نشست، برخاست وضع وقطع، بود و باش، کے طریقے زندگی کی ضرورتیں یہ معجزات انسانی مناظر قدرت صحرا جنگل سبزہ

زار آب رواں شجاعت جان بازی کی جیتی جاگتی صورتیں نظر آتی ہیں، جن کا مقابلہ کرنے میں ان کے معاصرین عاجز تھے''۔(۱۹)

'آب بقا' میں شعراء کے احوال میں جگہ جگہ خاکہ نگاری اور انشاء پردازی کے بھی نمونے پائے جاتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے احوال میں انشاء پردازی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

آہ! اے غم کیش ظفر! آہ! اے دہلی کی آخری یادگار! دنیا میں جس قدر عیش تو نے اٹھایا تھا، اس سے زیادہ تجھ کو مصیبت جھیلنا پڑی۔ آخر خاک رنگون تجھ کو کشاں کشاں لے گئی، جہاں آج تیری قبر کا نشان تک باقی نہ رہا۔ اب کوئی فاتحہ پڑھے تو کہاں اور دو پھول چڑھائے تو کس جگہ۔ اے پھولوں کی سیج پر کروٹیں بدلنے والے بادشاہ! آج تو ایک ایسے مکان میں سو رہا ہے، جہاں نہ مسہری ہے نہ چھپر کٹ، خاک کا بچھونا، خاک کا اوڑھنا، خاک کا تکیہ، مگر گھبرائے نہیں مست خلد تھے، ان مصیبتوں سے نجات ملنے والی ہے اور دائمی عیش و عشرت کا دروازہ تیرے واسطے کھلنے والا ہے''(۲۰)

میر نفیسؔ کا لکھنوی کا خاکہ کچھ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ:

''ستیلا منھ داغ، گندمی رنگ کتابی چہرہ کرنجی آنکھیں گول بدن اور دراز قد تھے۔ اس ضعیفی میں بھی کسرت کرنے کا شوق تھا۔ بازو پر جوشن کے مٹھے بندے ہوئے کمر کسی قدر خم ہو چلی تھی۔ ہاتھ میں چاندی کی شام کی جریب نما انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں لباس میں دہلی کا تتبع کرتے ڈھیلی مہری کا پانجامہ گھٹنوں تک کا مہین شربتی کا کرتا نیچی کمر توئی کا جامدانی کا انگرکھا چوگوشیہ ٹوپی داڑھی منڈی ہوئی مونچھیں بڑی بڑی۔''(۲۱)

'آب بقا' میں بعض شعراء کے احوال میں بعض اشعار کی تشریح بھی کی گئی ہے، جس سے مولف کی سخن سنجی کی عکاسی ہوتی ہے مثلاً لکھنوی آتش لکھنوی کے احوال میں آتشؔ کے مندرجہ ذیل شعر کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

حسن پری اک جلوہ مستانہ ہے اس کا
ہوشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

''حسن پری ہمارے معشوق (معشوق حقیقی) کا جلوہ مستانہ ہے۔ جو اس کا دیوانہ ہے وہی ہوشیار ہے۔ مصرعہ ادبی میں ہمہ اوست کے مسئلے کو حل کیا ہے یعنی حسن پری بھی اسی کے جلوہ مستانہ میں سے ہے۔ دیوانہ (شیدا) جو اس کا شیدا ہے وہی ہوشیار ہے۔ یہاں مراد اہل اللہ ہے۔ لفظی خوبیاں تو یہ ہیں کہ حسن پری اور جلوہ مستانہ سے کوئی اچھا لفظ نہیں مل سکتا تھا۔ ہوشیار اور دیوانے کی رعایت ہے۔ معنوی خوبیاں تو یہ ہے کہ تصوف کے ایک وسیع مسئلے کو مثال میں سمجھا دیا لیکن عیب ہے کہ اس میں (کہ) زائد اور ضرورت شعر کے لحاظ سے آیا ہے اور چھوٹی سی تاکید بھی ہے یعنی مستانہ اس کا ہے جاناں اس کا ہے چاہئے تھا۔''(۲۲)

اگر چہ جا بجا داستاں سرائی سے 'آب بقا' کو 'آبِ حیات' کے ہم پلہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن مؤلف کو اس میں قرار واقعی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ موجودہ زمانے میں ان کے ماخذ کے متعلق جگہ جگہ یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی اصل حیثیت کیا ہے اور یہ کہ مؤلف کے اس تذکرے کو کس بنا پر قابلِ حوالہ قرار دیا ہے اور یہ کہ اس کے مندرجات کس حد تک قابلِ اعتماد ہیں؟ جب تک ان سوالات کا جواب نہیں ملے گا، اس وقت تک پڑھنے والوں کے ذہن میں شبہات پیدا ہوتے رہیں گے۔ غالباً خواجہ عشرت نے تذکرہ آب بقا میں آزاد جیسی جادو نگاری دکھانے کی بڑی حد تک کوشش کی تھی۔ پھر بھی تحقیقی حلقوں میں آب بقا کا مطالعہ ایک غیر معتبر راوی کی سرمایہ ناز تالیف کی حیثیت سے کیا جاتا رہے گا۔

آخر میں دونوں نسخوں میں جو اختلاف متن ہے اس کو ترتیب وار پیش کیا جا رہا ہے۔ مقالے کی طوالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم حوالے کے طور پر تذکرہ آب بقا نسخہ منشی نول کشور لکھنؤ نسخۂ اول کے حوالے سے تحریر کریں گے۔ (۲۳)

اور 'تذکرہ آب بقا' نامی پریس لکھنؤ کو نسخۂ دوم کے حوالے سے شمار کریں گے۔ (۲۴)

دونوں تذکروں کا آغاز تمہید سے ہوتا ہے۔ تذکرے کا آغاز شاہ اختر (واجد علی شاہ) کے نام سے ہوتا ہے۔ تذکرہ آب بقا نامی پریس میں واجد علی شاہ کے بعد ازل لکھنوی کا تذکرہ ہے جو کہ نسخۂ اول میں موجود نہیں ہے۔ (۲۵)

۱۔ خواجہ حیدر علی آتش کے مضمون میں تحریر ہے کہ ''نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی نواب خانِ خانان کی پوتی سے کی، جس میں چوبیس لاکھ روپیہ صرف کیا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۷ء کا ہے۔'' (آب بقا، نول کشور ص۱۲)

یہی واقعہ آب بقا نامی پریس میں صفحہ نمبر ۹ پر ۱۷۶۸ء کے حوالے سے تحریر ہے۔

۲۔ نسخۂ اول میں اسیر مغفور کے مضمون کے آخر میں شاعری کا انتخاب موجود نہیں ہے۔ جبکہ نسخۂ دوم کے صفحہ نمبر ۳۶ میں اسیر مغفور کے سات اشعار بطور انتخاب موجود ہیں۔

۳۔ نسخۂ دوم میں نواب آصف الدولہ پر مضمون موجود ہے جو نسخۂ اول میں موجود نہیں ہے۔

۴۔ نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر ۳۵ پر تعشق مرحوم کے نام سے مضمون موجود ہے، جبکہ نسخۂ اول میں اِن کا تذکرہ موجود ہو نہیں ہے۔

۵۔ نسخۂ دوم میں صفحہ۴۳ میں میر یار علی جان صاحب کے حوالے سے مضمون معہ انتخاب موجود ہے جب کہ نسخۂ اول اس مضمون سے محروم ہے۔

۶۔ نسخۂ دوم میں مرزا بہادر جگر کے بعد صفحہ نمبر ۴۶ پر میر علی اوسط رشک مرحوم کے نام سے مضمون موجود ہے۔نسخۂ اول اس ذکر سے محروم ہے۔

۷۔ نسخۂ دوم میں جناب رشید لکھنوی کے بعد صفحہ نمبر۵۴ پر راقم منشی بندر ابن دہلوی شاگرد سودا کے عنوان سے مضمون موجود ہے۔جبکہ نسخۂ اول اس ذکر سے خالی ہے۔

۸۔ نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر۶۲ پر مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی (سرور مرحوم) کے نام سے تذکرہ موجود ہے۔جبکہ نسخۂ اول اس نثر نگار کے تذکرے سے محروم ہے۔

۹۔ نسخۂ دوم میں پیرو میر کے بعد شیخ عبدالرؤف مرحوم (شعور مرحوم) صفحہ نمبر۵۷ پر ذکر موجود ہے، جب کہ نسخۂ اول اس ذکر سے آشنا نہیں ہے۔

۱۰۔ نسخۂ دوم میں صفیر بلگرامی کے بعد صفحہ نمبر ۷۹ میں مولانا سید علی نقی (صفی لکھنوی) کا ذکر معہ انتخاب موجود ہے، جب کہ نسخۂ اول میں ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔

۱۱۔ نسخۂ دوم میں شہنشاہِ ظفر کے بعد صفحہ نمبر۸۷ پر نواب طالب علی خان بہادر (عیشی مرحوم) معہ انتخاب موجود ہے، جب کہ نسخۂ اول میں اس کا ذکر موجود نہیں ہے۔

۱۲۔ نسخۂ اول میں صفحہ نمبر۹۹ پر جناب عارف مرحوم کے نام سے مضمون موجود ہے۔ جب کہ نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر۸۸ پر یہی مضمون عارف مرحوم کے نام سے موجود ہے۔

۱۲۔ نسخۂ دوم کے صفحہ نمبر۹۲ پر میر سجاد حسین (فلک مرحوم) کے عنوان سے مضمون موجود ہے۔ جب کہ نسخۂ اول فلک مرحوم کے ذکر سے محروم ہے۔

۱۳۔ نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر۱۰۰ پر مومن مرحوم کا ذکر موجود ہے۔جب کہ نسخۂ اول اِس کے ذکر سے محروم ہے۔

۱۴۔ نسخۂ دوم کے صفحہ نمبر۱۱۱ پر سید افتخار حسین (مضطر مرحوم) معہ انتخاب موجود ہے۔ جب کہ نسخۂ اول میں یہ ذکر موجود نہیں ہے۔

۱۵۔ نسخۂ دوم کے صفحہ نمبر۱۲۰ پر نواب محمد یوسف علی خان والیِ رام پور (ناظم مرحوم) کے عنوان سے مضمون موجود ہے۔ جب کہ نسخۂ اول ناظم مرحوم کے ذکر سے خالی ہے۔

۱۶۔ نسخۂ دوم کے صفحہ نمبر ۱۲۸ پر سید نظام علی شاہ (نظام مرحوم) کے عنوان سے مضمون موجود ہے۔ جب کہ نسخۂ اول نظام مرحوم کے ذکر سے محروم ہے۔

۱۷۔ نسخۂ اول کے مضمون وسیم خیرآبادی کے صفحہ نمبر ۱۵۴ پر موجود معلومات جو ذیل میں دی جارہی ہیں۔ نسخۂ دوم میں وسیم خیرآبادی کے مضمون میں یہ معلومات موجود نہیں ہیں۔

''ایک مصرعہ پانچ عدد کے نغمے کے ساتھ ہے۔

ہما کے منہ سے ہے کیسا ہمایوں یہ پری مصرع

مہاراجہ! یہ فرزند پری پیکر مبارک ہو

شعر کو سن کر بہت افسوس ہوا کہ یہ جلسہ ریاست کی طرف سے نہیں تھا لیکن یہ معلوم کر کے کچھ اطمینان ہوا کہ شعرا کو ریاست کی طرف قصاید کا صلہ عطا ہوگا اور خارجاً یہ بھی افواہ سنی گئی کہ دو ہزار روپیہ دینار یاست نے منظور کیا ہے۔ مگر ابھی شعرا متوقع ہیں۔ وسیم پرانے مشاق شاعر ہیں اور آپ کی مشق سخن چالیس پینتالیس سال کی ہے اور منشی صاحب مرحوم کی صحبت میں رہنے کا بہت اتفاق ہوا ہے۔ دفتر میر اللغات میں مدت تک کام کیا ہے۔ اب سنا گیا ہے کہ ریاست حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی قائم ہونے والی ہے اور اس صیغہ میں اردو زبان دانوں کے لیے بہت جگہ ہوگی۔ اگر ریاست اس وقت کے موجودہ چند سن رسیدہ شاعروں کو یونیورسٹی میں لے لے تو زبان کا آغاز بااصول ہو جائے گا اور یہ لوگ چراغ سحری ہیں۔ چند روز سے زیادہ ریاست کا نمک نہیں کھا سکتے۔ ہمارے نزدیک جناب وسیم، جناب ریاض، جناب کوثر، جناب نظم، طباطبائی، جناب رشید، جناب فصاحت، جناب افضل، جناب امجد لکھنوی، جناب بیخود دہلوی وغیرہ کو اردو یونیورسٹی میں داخل ہونا ضروری ہے تا کہ اس کی ابتدائی بااصول قائم ہو اور یہ بات یادگار رہ جائے گی کہ یونیورسٹی میں ایسے ایسے سخن سنج لوگ داخل تھے۔ ایسے چند نفوس پھر زمانہ پیدا نہ کرے گا۔ آج کل ان کا وجود اردو کے لیے غنیمت ہے۔''

۱۸۔ نسخۂ اول میں صفحہ نمبر ۱۵۵ پر ہوس دہلوی کے نام سے مضمون موجود ہے۔ جب کہ نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر ۱۳۶ پر ہوس مرحوم کے نام سے یہ مضمون موجود ہے۔ جو کہ ذیل میں دی گئی معلومات سے محروم ہے:

''مگر خلاصہ اودھ کا مصنف لکھتا ہے کہ نواب محمد اسحاق خان کی کوئی اولاد جیتی نہ تھی۔ اس سبب سے محمد شاہ بادشاہ دہلی نے بہو بیگم صاحبہ کو اپنی بیٹی بنایا تھا اور شادی بھی محمد شاہ بادشاہ نے ان کی کی۔ بلکہ نواب محمد اسحاق خان نے بادشاہ سے کہا کہ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کی شادی مجھے کرنے کی اجازت دیجئے۔ بادشاہ نے

منظور نہ کیا اور کہا تم کو جس قدر دینا ہو بطور نوید کے دے سکتے ہو۔تو نواب محمد اسحاق خان نے اپنا تمام زر، زیور، جواہرات، مال واسباب بطور نوید پیش کیا اور بائیسویں صوبہ کے صوبہ داروں نے اپنے حوصلے سے زیادہ نوید میں زر جواہر دیا۔شادی کے وقت ان کی عمر۲۴ برس تھی۔ ۱۱۵۸ھ میں ان کی شادی ہوئی۔

اس کے علاوہ وثیقے میں بھی کہیں مرزا محمد تقی خان ہوس کا نام نہیں ہے کیونکہ بہو بیگم صاحبہ نے ستر لاکھ روپیہ اپنے اعزا اور ملازمین کے وثیقے میں جمع کیا۔اس میں مرزا علی خاں کے نام وثیقہ ہے اور ان کو اپنے بھائی بیان کیا ہے لیکن ان کی کسی اولاد کا ذکر نہیں ہے۔اسی طرح سالار جنگ کو اپنا بھائی بیان کیا ہے۔ان کے تین بیٹے مرزا قاسم علی خان، مرزا اکبر علی خان، مرزا اصغر علی خان کا ایک ایک ہزار روپیہ وثیقہ بھی لکھا ہے۔ بلکہ ان کے اور متعلقین مرزا جوہر، مرزا مہتر، مرزا عباس تک کی تنخواہ درج ہے۔ممکن ہے کہ یہ بھائی مختلف بطن سے ہوں۔تو بھی ہوس کا نام وثیقہ میں ضرور ہوتا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا محمد تقی خان کو یہ کیا ہوا کہ یہ محل ملک تو کجا فرزند نہ تھے۔

دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ ہوسؔ بی لطف النسا اسی دام میں کہ اسیر بے پر بال تھا۔تخلص ہوسؔ تھا اور ان کے بیٹے مرزا حیدر تھے۔ یہ مرزا اوالا جاہ کے مورث اعلیٰ تھے۔مگر اس کی تصدیق کسی صحیح تاریخ سے نہیں ملتی۔مرزا محمد تقی خان ہوسؔ کا طرز کلام بتاتا ہے کہ وہ دہلوی تھے اور دہلی کی زبان نظم کرتے تھے۔نواب بہو بیگم صاحبہ کے تمام خاندان کے لوگ لکھنؤ کی زبان استعمال کرتے تھے۔

منشی قمر صاحب نے بھی بیان کیا کہ میں نے مرزا علی خان بہادر کو دیکھا ہے وہ معالی خاں کی سرائے میں رہتے تھے۔ان کی اولاد میں ہوسؔ نہ تھے۔ یہ کوئی دوسرے شاعر تھے اور مرزا محمد تقی خان بی لطف النسا کے شوہر کو تو میں جانتا ہوں۔ وہ آتشؔ کے شاگرد تھے۔ان کا تخلص مجھے یاد نہیں۔مرزا محمد تقی خان ہوسؔ میر تقی میرؔ کے ہم عصر تھے۔ بہر حال ہوسؔ دہلی کے رہنے والے تھے اور دہلی سے فیض آباد عہد نواب شجاع الدولہ میں آئے تھے''۔

۱۹۔ نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر ۱۳۹ پر میر ہدایت علی ہدایت (ہدایت مرحوم) کا مضمون موجود ہے۔ جب کہ نسخۂ اول میں یہ مضمون موجود نہیں ہے۔

۲۰۔ نسخۂ اول میں صفحہ نمبر ۱۹۸ پر موجود مضمون'' مشاہیر شعرا کے مزار'' نسخۂ دوم کے صفحہ نمبر ۱۷۰ پر بعنوان'' مشاہیر شعرا کے مزار'' ذیل میں دی گئی معلومات سے محروم ہے:

''مولوی غلام محمد خان تپش دہلوی اخبار مشیر قیصر کے ایڈیٹر مدت تک اودھ اخبار کے ایڈیٹر بھی رہے۔ امیر اللغات پر بڑے بڑے اعتراض کئے۔ ریاض سے چوٹیں چلتی رہیں ۱۳۲۰ھ میں انتقال کیا۔ عیش باغ میں دفن ہوئے۔

مرزا پناہ علی افسردہ داروغہ نواب بہو بیگم صاحبہ مشہور مرثیہ گو تھے۔ منصور نگر میں رہتے تھے۔ خوشحال تھے ۱۲۵۰ھ میں انتقال کیا۔ ان کے مرثیوں کی سات جلدیں تھیں جو غدر کے بعد ان کے ورثا نے کسی مرثیہ گو کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں۔ کربلائے تالکٹورہ میں دفن ہوئے۔ ان کے پوتے نواسے لکھنؤ میں موجود ہیں۔''

۲۱۔ نسخۂ اول کے صفحہ ۲۰۵ بحوالہ شعرا کے مزار میں ''میر برشتہ۔ شاگرد ذوق مرحوم کا بہت اچھا کلام تھا''۔ جب کہ نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر ۱۷۶ پر یہ عبارت ''میر تشتہ'' کے نام سے مرقوم ہے۔

۲۲۔ نسخۂ اول کے صفحہ ۲۰۵ بحوالہ شعرا کے مزار میں آغا حجو ہندی کے بارے میں لکھا ہے کہ ''مزار کا پتہ معلوم نہیں ہوا''۔ جب کہ نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر ۱۷۶ پر ان کا مزار ''غفران مآب کے امام باڑے میں'' قبر کا تذکرہ موجود ہے۔

۲۳۔ نسخۂ اول کے صفحہ ۲۰۶-۲۰۷ بحوالہ شعرا کے مزار میں مرزا علی محمد عرف منے آغا صاحب میں درج ذیل عبارت اور اشعار موجود ہے۔ جب کہ نسخہ دوم اس سے محروم ہے:

اولادوں میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی۔ لوح مزار پر میر اعجاز حسین صاحب اعجاز لکھنوی کی یہ تاریخ کندہ ہے۔

چل رہاہے خزاں کا جھونکا آہ	گل سوئے ہیں چراغ کیا کیا آہ
ہائے کس کس کے سہئے صدمے آہ	صورتیں چھپ گئیں ہیں صدہا آہ
بس چلے کیا قضا کے ہاتھوں سے	دق ہوئے ہیں جوان رعنا آہ
شیعہ خالص برادر مومن	بے نظیر اور حسین رعنا آہ
دوپہر، پیر چودھویں ذیقعد	ہوئی خالی سرائے دنیا آہ
مصرعہ سال ہوگیا اعجاز	ہائے صد حیف مُنے آغا آہ

مولوی عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی نے بھی تاریخ وفات لکھی جو ان کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے۔

نحس خالی کی چودھویں تھی اکلیم
ہائے مشفق مرے کہاں گئے آج
کہا ہاتف نے سال ہجری میں
مُنے آغا سوئے جناں گئے آج

۲۴۔ نسخۂ اول کے صفحہ ۲۰۸ بحوالہ شعرا کے مزار میں یہ اشعار مذکور ہیں جب کہ نسخۂ دوم صفحہ نمبر ۱۷۸ ان اشعار سے محروم ہے۔

زینب نے کہا لاشئہ سرور سے لپٹ کر اے میرے برادر
کفناؤں میں کیوں کر تمہیں رکھتی نہیں چادر اے میرے برادر
آنکھوں کو ذرا کھول کے دیکھو تو میں واری میت پہ تمہاری
روتے ہیں علی اور ہیں زہرا بھی کھلے سر اے میرے برادر

۲۵۔ نسخۂ اول کے صفحہ ۲۰۸ بحوالہ شعرا کے مزار میں یہ عبارت ''افسوس کہ لوح مزار پر کوئی قطعہ نہیں ہے''۔ مرزا بہادر علی عرف چھٹن صاحب مشتاق کے بارے میں مذکور ہے۔ جبکہ نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر ۱۷۸ پر یہ عبارت موجود نہیں ہے۔

۲۶۔ نسخۂ اول کے صفحہ ۲۰۹ بحوالہ شعرا کے مزار میں یہ شعر درج ہے۔

واہ دل کو مرے سینے میں سنبھلنے نہ دیا
کوئی پہلو ترے ناوک نے بدلنے نہ دیا

جبکہ یہ شعر نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر ۱۷۸ پر اس طرح درج ہے۔

دردِ دل کو مرے سینے میں سنبھلنے نہ دیا
کوئی پہلو ترے ناوک نے بدلنے نہ دیا

۲۷۔ نسخۂ اول کے صفحہ ۲۰۹ بحوالہ شعرا کے مزار میں یہ شعر درج ہے۔

سر بالیں وہ بیٹھے ہیں ہمارا دم نکلتا ہے
ٹھہر جا اے اجل اس وقت ان کا جی بہلتا ہے

جبکہ یہ شعر نسخۂ دوم میں صفحہ نمبر ۱۷۹ پر اس طرح درج ہے:

سر بالیں وہ بیٹھے ہیں ہمارا دم نکلتا ہے
ٹھہر جا اے اجل اس وقت ان کا دل بہلتا ہے

۱۳۱۶ھ

۲۸۔ نسخہ اول میں صفحہ ۲۰۳ میں میرزا محمد تقی خان ہوشؔ کا تذکرہ ہے جو دو سطروں تک محدود ہے، نسخہ دوم میں یہ صفحہ ۱۷۵ پر موجود ہونا چاہیے تھا، مگر یہ ذکر موجود نہیں ہے۔

۲۹۔ نسخہ اول میں صفحہ ۲۰۳ پر شاہ یقین دہلوی کا ذکر موجود ہے، نسخہ دوم صفحہ ۱۷۴ اس شاعر کے ذکر سے محروم ہے۔

حاصلِ کلام

'تذکرہ آب بقا' اپنی تمام تر خوبیوں وخامیوں کے ساتھ آج بھی ادبی دنیا کا ایک مستند ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی محقق یا تنقید نگار اس سے دامن بچا کر چلتا ہو۔ بہر حال تذکرہ آب بقا اپنی زمانی اور مکانی حیثیت سے تحقیق کرنے والوں کے لیے روشن مینار کی طرح ہے، جس سے ماضی کے ان اوراقوں پر روشنی پڑتی ہے جنہیں وقت کے مہیب اندھیروں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خواجہ عشرت مرحوم' از مرزا خنجر لکھنوی، مشمولہ: سہیل گیا، اگست ۱۹۴۰ء ص ۲۰۔
۲۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص ۶۱۔
۳۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص ۶۲۔۶۳۔
۴۔ خواجہ عشرت مرحوم' از مرزا خنجر لکھنوی، مشمولہ: سہیل گیا، اگست ۱۹۴۰ء ص ۲۰۔
۵۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص ۶۳۔
۶۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص ۶۴۔
۷۔ نیاز سلطان پوری، ڈاکٹر، اردو تذکرہ نگاری ۱۸۳۵ء کے بعد، مکتبہ دین وادب، امین الدولہ پارک۔ امین آباد، لکھنو، دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۲۱۰۔
۸۔ آب بقا نول کشور پریس لکھنؤ، ص ۱۹۶۔
۹۔ خواجہ عشرت مرحوم' از مرزا خنجر لکھنوی، مشمولہ: سہیل گیا، اگست ۱۹۴۰ء ص ۲۳۔
۱۰۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص ۸۲۔

۱۱۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص۸۳۔
۱۲۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص۸۴۔
۱۳۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص۸۴۔
۱۴۔ آب بقا نول کشور پریس لکھنوٴ، ص۸۵۔
۱۵۔ نیاز سلطان پوری، ڈاکٹر، اردو تذکرہ نگاری ۱۸۳۵ء کے بعد، مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک امین آباد، لکھنوٴ، دسمبر ۱۹۹۸ء، ص۲۱۱۔
۱۶۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص۸۶۔
۱۷۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص۸۵۔
۱۸۔ آب بقا نول کشور پریس لکھنوٴ، ص۹۱۔
۱۹۔ آب بقا نول کشور پریس لکھنوٴ، ص۶۳۔
۲۰۔ آب بقا نول کشور پریس لکھنوٴ، ص۲۲۔
۲۱۔ آب بقا نول کشور پریس لکھنوٴ، ص۲۲۔
۲۲۔ آب بقا نول کشور پریس لکھنوٴ، ص۱۳۷۔
۲۳۔ آب بقا نول کشور پریس لکھنوٴ، ص۲۳۔
۲۴۔ تذکرہ آب بقا، مرتبہ مرزا جعفر علی نشتر لکھنوی، منشی نول کشور پریس لکھنوٴ حضرت گنج میں چھپا۔ فروری ۱۹۱۸ء۔
۲۵۔ آب بقا، مؤلفہ خواجہ عبدالروٴف عشرت مرتبہ مرزا جعفر علی صاحب نشتر، قطب الدین احمد پروپرائٹر نامی پریس لکھنوٴ میں چھپا۔

مآخذات

۱۔ نشتر لکھنوی، مرزا جعفر علی، تذکرہ آب بقا، (مرتبہ)، (لکھنو، منشی نولکشور پریس حضرت گنج، فروری، ۱۹۱۸)۔
۲۔ نشتر لکھنوی، مرزا جعفر علی صاحب، تذکرہ آب بقا، (مرتبہ)، (لکھنو، قطب الدین احمد پروپرائٹر نامی پریس، س، ن)۔
۳۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، (لکھنو، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۰)۔
۴۔ نیاز سلطان پوری، ڈاکٹر، اردو تذکرہ نگاری ۱۸۳۵ء کے بعد، (لکھنوٴ، مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک امین آباد، دسمبر ۱۹۹۸)۔
۵۔ خواجہ عشرت مرحوم' از مرزا خنجر لکھنوی، مشمولہ (سہیل گیا، اگست ۱۹۴۰)۔